جماعت اسلامی

کی

دعوت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت اسلامی کی دعوت

۹، ۱۰ رمئی ۱۹۴۷ کو دارالاسلام پٹھان کوٹ میں جماعت کا جو اجتماع منعقد ہوا تھا افسوس ہے کہ اس کی روداد مشرقی پنجاب کے فساد عظیم کی نذر ہوگئی، بلکہ اس کے مسودات کا بھی بڑا حصہ دینا نگر میں تلف ہوگیا۔ اب خوش قسمتی سے کاغذات میں میری دو تقریروں کے مسودے مل گئے۔ جنھیں اجتماع کے بعد قلم بند کیا گیا تھا، پہلی تقریر افتتاحی تقریر تھی، اس میں جماعت اسلامی کے مقصد کی تشریح کی گئی تھی اور دوسری جلسۂ عام میں کی گئی تھی اور اس میں ''بناؤ بگاڑ'' کے متعلق سنت اللہ کو بہ تفصیل بیان کیا گیا تھا۔ اگرچہ دونوں تقریریں پرانی ہو چکی ہیں مگر ان کا مضمون پرانا نہیں ہوا ہے۔ توقع ہے کہ ان کا مطالعہ ناظرین کے لیے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ہماری یہ جماعت جس غرض کے لیے اٹھی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں اور آغاز کار کے طور پر اس ملک میں، ایک ایسی سوسائٹی منظم کی جائے جو اسلام کے اصلی اصولوں پر شعور و اخلاص کے ساتھ خود عامل ہو، دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اس کی صحیح نمایندگی کرے، اور بالآخر جہاں جہاں بھی اس کی طاقت بڑھتی جائے وہاں کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست اور معیشت کے نظام کو موجودہ دہریت و مادہ پرستی کی بنیادوں سے ہٹا کر سچی خدا پرستی، یعنی توحید کی بنیاد پر قائم کر دے۔ اس جماعت کو یہ یقین ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کا پورا نظام زندگی جن اصولوں پر قائم ہے وہ قطعاً فاسد اصول ہیں اور اگر دنیا کا انتظام ان ہی اصولوں پر چلتا رہا تو بڑے ہولناک نتائج سے دوچار ہوگی ـــــ اس کے جو نتائج اب تک نکل چکے ہیں، وہ بھی کچھ کم ہولناک نہیں ہیں، مگر انھیں کوئی نسبت اس انجام کی ہولناکی سے نہیں ہے، جس کی طرف یہ تہذیب دنیا کو لیے جارہی ہے ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ ہم اس دنیا سے کہیں باہر نہیں جی رہے ہیں۔ بلکہ اس کے

اندر ہی سانس لے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ان اصولوں کو فاسد اور بدانجام سمجھتے ہوئے بھی منفعلانہ طریقے سے اسی نظام کے تحت زندگی بسر کیے جائیں اور تہذیب حاضر کے مغربی اماموں اور مشرقی مقلدوں کی پیشوائی و سربراہ کاری کے آگے سپر ڈالے رہیں، تو جس تباہی کے گڑھے میں یہ دنیا گرے گی اسی میں اس کے ساتھ ہم بھی جا گریں گے اور ہم اس انجام کے مستحق ہوں گے۔

ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں، اور اپنے اس علم پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے انسان کی رہنمائی کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت نازل کی ہے اسی کی پیروی میں ہماری اور سب انسانوں کی فلاح مضمر ہے، اور انسانی زندگی کا پورا نظام اسی وقت صحیح چل سکتا ہے جب کہ اسے ان اصولوں پر قائم کیا جائے جو انسان کے خالق کی دی ہوئی اس ہدایت میں ہم کو ملتے ہیں۔

ہمارے اس علم و یقین سے یہ فرض خود بہ خود ہم پر عائد ہو جاتا ہے اور یہی فرض خدا نے بھی اپنے مطیع فرمان بندوں پر عائد کیا ہے ــــ کہ ہم اس نظام زندگی کے خلاف جنگ کریں، جو فاسد اصولوں پر چل رہا ہے اور وہ صالح نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں جو خدائی ہدایت کے دیے ہوئے اصولوں پر مبنی ہو۔ یہ کوشش صرف اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا کی خیر خواہی ہم سے اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ نہیں ہم خود اپنے بھی سخت بدخواہ ہوں گے اگر اسی سعی و جہد میں اپنی جان نہ لڑائیں۔ کیوں کہ جب اجتماعی زندگی کا سارا نظام فاسد اصولوں پر چل رہا ہو، جب باطل نظریات و افکار ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں، جب خیالات کو ڈھالنے اور اخلاق و سیرت کو بنانے کی عالم گیر طاقتوں پر فاسد نظام تعلیم گم راہ کن ادبیات، فتنہ انگیز صحافت اور شیطنیت سے لبریز ریڈیو اور سنیما کا تسلط ہو، جب رزق کے تمام وسائل پر ایک ایسے معاشی نظام کا قبضہ ہو جو حرام و حلال کی قیود سے نا آشنا ہے، جب تمدن کی صورت گری کرنے اور اس کو ایک خاص راہ پر چلانے کی ساری طاقت ایسے قوانین اور ایسی قانون ساز مشینری کے ہاتھ میں ہو جو اخلاق و تمدن کے سراسر مادہ پرستانہ تصورات پر مبنی ہیں، اور جب قوموں کی امامت اور انتظام دنیا کی پوری زمام کاران لیڈروں اور حکمرانوں کے ہاتھ میں ہو، جو خدا کے خوف سے خالی اور اس کی رضا سے بے نیاز ہیں اور اپنے کسی معاملے میں بھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان کے خالق کی ہدایت اس معاملے میں کیا ہے، تو ایسے نظام کی ہمہ گیر گرفت میں رہتے ہوئے ہم خود اپنے آپ کو ہی اس کے برے اثرات اور بدتر نتائج سے کب بچا سکتے ہیں۔ یہ نظام جس جہنم کی طرف جا رہا ہے اسی طرف

وہ دنیا کے ساتھ ہمیں بھی گھسیٹے لیے جارہا ہے۔ اگر ہم اس کی مزاحمت نہ کریں اور اس کو بدلنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور نہ لگائیں، تو یہ ہماری، اور ہماری آیندہ نسلوں کی دنیا خراب اور عاقبت خراب تر کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا محض دنیا کی اصلاح ہی کے لیے نہیں بل کہ خود اپنے بچاؤ کے لیے بھی یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے ـــــ اور یہ سب فرضوں سے بڑا فرض ہے ـــــ کہ ہم جس نظام زندگی کو پوری بصیرت کے ساتھ فاسد و مہلک جانتے ہیں اسے بدلنے کی سعی کریں اور جس نظام کے برحق اور واحد ذریعۂ فلاح و نجات ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اسے عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔

اس مختصر گزارش سے آپ یہ بات پا گئے ہوں گے کہ ہمارا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بلکہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے اور ان ہی اصولوں پر چلتا رہے مگر اس کو مغربی نہ چلائے مشرقی چلائے۔ یا انگریز نہ چلائے ہندستانی چلائے یا ہندو نہ چلائے مسلمان چلائے۔ ہمارے نزدیک ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سور تو بہ ہر حال سور ہی ہے اور اپنی ذات میں ناپاک ہے، خواہ اسے غیر مسلم باورچی پکائے یا مسلمان باورچی پکائے بلکہ مسلمان باورچی کا سور پکانا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے اور گم راہ کن بھی۔ بہت سے بندگان خدا حتیٰ کہ اچھے خاصے پرہیز گار لوگ بھی اس ظالم کے ہاتھ کا پکا ہوا سور اس اطمینان پر کھا جائیں گے کہ یہ مسلمان نے پکایا ہے۔ اور اگر اس پخت و پز کے دوران میں چمچے کی ہر گردش پر وہ بہ آواز بلند بسم اللہ پڑھ دیا کرے اور اس کے چنے ہوئے دسترخوان پر مسلمانوں کو غیر مسلم کے دسترخوان کی بہ نسبت تناول ماحضر کی زیادہ آسانیاں اور آزادیاں میسر ہوں اور محفل طعام کے گرد و پیش کچھ ایسے لوازم بھی فراہم کر دیے جائیں جو عام طور پر اسلامی لوازم سمجھے جاتے ہیں تو اس قسم کی نمایشی باتیں اس حرام خوراک کو قبول کر لینے کے لیے کوئی سفارش نہ ہونی چاہییں۔ بلکہ یہ ظاہر فریبیاں اس معاملے کو اور بھی زیادہ پرخطر بنا دیتی ہیں۔ لہٰذا ہم کسی ایسی ظاہری تبدیلی پر خود نہ مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کو مطمئن ہوتے دیکھ سکتے ہیں، جس میں یہ فاسد نظام تو جوں کا توں قائم رہے اور صرف اس کے چلانے والے ہاتھ بدل جائیں۔ ہماری نظر ہاتھوں پر نہیں بلکہ ان اصولوں پر ہے، جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے۔ وہ اصول اگر فاسد ہوں تو ہم ان کے خلاف جدوجہد جاری رکھیں گے اور انھیں صالح اصولوں سے بدلنے کی کوشش کریں گے۔

یہ تو ہے ہمارا مدعا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بھی واضح طور پر سمجھ لیں کہ موجودہ تہذیب کے وہ اصول کیا ہیں، جن کو ہم مٹانا چاہتے ہیں اور ان کے جواب میں دوسرے اصول کون سے ہیں، جن کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ تہذیب، جس پر آج دنیا کا پورا فکری، اخلاقی، تمدنی، سیاسی اور معاشی نظام چل رہا ہے وہ دراصل تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔

۱۔ سیکولرزم (Secularism) یعنی لادینی یا دنیاویت

۲۔ نیشنلزم (Nationalism) یعنی قوم پرستی

۳۔ ڈیموکریسی (Democracy) یعنی حاکمیت جمہور

ان میں سے پہلے اصول، یعنی لادینی کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ہدایت اور اس کی عبادت کے معاملے کو ایک ایک شخص کی ذاتی حیثیت تک محدود کر دیا جائے اور انفرادی زندگی کے اس چھوٹے سے دائرے کے سوا دنیا کے سارے معاملات کو ہم خالص دنیوی نقطۂ نظر سے اپنی صواب دید کے مطابق خود جس طرح چاہیں طے کریں۔ ان معاملات میں یہ سوال خارج از بحث ہونا چاہیے کہ خدا کیا کہتا ہے اور اس کی ہدایت کیا ہے اور اس کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ ابتداءً یہ طرزِ عمل اہل مغرب نے عیسائی پادریوں کی اس خود ساختہ دینیات سے بیزار ہو کر اختیار کیا تھا، جو ان کے لیے زنجیر پا بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی طرزِ عمل ایک مستقل نظریۂ حیات بن گیا اور تہذیب جدید کا پہلا سنگ بنیاد قرار پایا۔ آپ نے اکثر یہ فقرہ سنا ہوگا کہ "مذہب ایک پرائیوٹ معاملہ ہے، خدا اور بندے کے درمیان" یہ مختصر سا فقرہ دراصل تہذیب حاضر کا "کلمہ" ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ اگر کسی کا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی پرستش کرنی چاہیے تو اپنی انفرادی زندگی میں بہ خوشی اپنے خدا کو پوجے، مگر دنیا اور اس کے معاملات سے خدا اور مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ اس "کلمہ" کی بنیاد پر جس نظام زندگی کی عمارت اٹھی ہے، اس میں انسان اور انسان کے تعلق اور انسان اور دنیا کے تعلق کی تمام صورتیں خدا اور مذہب سے آزاد ہیں۔ معاشرت ہے تو اس سے آزاد، تعلیم ہے تو اس سے آزاد، معاشی کاروبار ہے تو اس سے آزاد، قانون ہے تو اس سے آزاد، پارلیمنٹ ہے تو اس سے آزاد، سیاست اور انتظام ملکی ہے تو اس سے آزاد، بین الاقوامی ربط و ضبط ہے تو اس سے آزاد۔ زندگی کے ان بے شمار مختلف پہلوؤں میں جو

کچھ بھی طے کیا جاتا ہے اس سوال کو نہ صرف نا قابلِ لحاظ، بلکہ اصولاً غلط اور انتہائی تاریک خیالی سمجھا جاتا ہے کہ ان امور کے متعلق خدا نے بھی کچھ اصول اور احکام ہمارے لیے مقرر کیے ہیں یا نہیں؟ رہی انفرادی زندگی تو وہ بھی لادینی تعلیم اور بے دین اجتماعیت کی بہ دولت اکثر و بیش تر افراد کے معاملے میں نری دنیاوی ہی ہو کر رہ گئی ہے اور ہوتی چلی جارہی ہے۔ کیوں کہ اب بہت ہی کم افراد کا ضمیر واقعی یہ گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی بندگی کرنی چاہیے۔ خصوصاً جو لوگ اس وقت تمدن کے اصلی کارفرما اور کارکن ہیں۔ ان کے لیے تو مذہب اب ایک پرائیوٹ معاملہ بھی نہیں رہا ہے، ان کا ذاتی تعلق بھی خدا سے ٹوٹ چکا ہے۔

دوسرے اصول، یعنی قوم پرستی کی ابتدا تو پوپ اور قیصر کے عالم گیر استبداد کے خلاف رجعت کے طور پر ہوئی تھی اور اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ مختلف قومیں اپنی اپنی سیاست و مصلحت کی آپ ہی مالک و مختار ہوں، کسی عالم گیر روحانی یا سیاسی اقتدار کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح نہ کھیلیں۔ مگر اس معصوم آغاز سے چل کر جب یہ تخیل آگے بڑھا تو رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ جس جگہ سے بے دینی کی تحریک نے خدا کو بے دخل کیا تھا وہاں قومیت کو لا بٹھایا گیا۔ اب ہر قوم کے لیے بلند ترین اخلاقی قدر اس کا قومی مفاد اور اس کے قومی حوصلے (Aspiration) ہیں۔ نیکی وہ ہے جو قوم کے لیے مفید ہو، خواہ وہ جھوٹ ہو، بے ایمانی ہو، ظلم ہو، یا اور کوئی ایسا فعل ہو جو پرانے مذہب و اخلاق میں بدترین گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اور بدی وہ ہے جس سے قوم کے مفاد کو نقصان پہنچے، خواہ وہ سچائی ہو، انصاف ہو، ادائے حق ہو، یا اور کوئی ایسی چیز ہو جسے کبھی فضائل اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا۔ افرادِ قوم کی خوبی اور زندگی و بیداری کا پیمانہ یہ ہے کہ قوم کا مفاد ان سے جس قربانی کا مطالبہ کرے، خواہ وہ جان و مال اور وقت کی قربانی ہو یا اخلاق و انسانیت اور شرافتِ نفس کی، بہر حال وہ اس میں دریغ نہ کریں اور متحد و منظم ہو کر قوم کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو پورا کرنے ںں لگے رہیں۔ اجتماعی کوششوں کی غایت اب یہ ہے کہ ہر قوم ایسے افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد بہم پہنچائے اور ان میں ایکا اور نظم پیدا کرے تا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنی قوم کا جھنڈا بلند کریں۔

تیسرے اصول، یعنی جمہور کی حاکمیت (Sovereignty of the people) کو ابتداءً بادشاہوں اور جاگیرداروں کے اقتدار کی گرفت توڑنے کے لیے پیش کیا گیا تھا، اور اس حد تک

بات درست تھی کہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقے کو لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی مسلط کر دینے اور اپنی اغراض کے لیے انھیں استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اس منفی پہلو کے ساتھ اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ ایک ایک ملک اور ایک ایک علاقے کے باشندے اپنے آپ حاکم اور اپنے آپ مالک ہیں۔ اسی مثبت پہلو پر ترقی کر کے جمہوریت نے اب جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم اپنی مرضی کی مختار کل ہے۔ اس کی مجموعی خواہش (یا عملاً اس کی اکثریت کی خواہش) کو پابند کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اخلاق ہو یا تمدن، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز کے لیے برحق اصول وہ ہیں جو قومی خواہش سے طے ہوں، اور جن اصولوں کو قوم کی رائے عام رد کر دے وہ باطل ہیں۔ قانون قوم کی مرضی پر منحصر ہے، جو قانون چاہے بنائے اور جس قانون کو چاہے توڑ دے۔ حکومت قوم کی رضا کے مطابق بنی چاہیے، قوم ہی کی رضا کا اسے پابند ہونا چاہیے، اور اس کی پوری طاقت قومی خواہش کو پورا کرنے پر صرف ہونی چاہیے۔

یہ تین اصول جن کی تشریح میں نے مختصراً آپ کے سامنے بیان کی ہے موجودہ دور کے نظام زندگی کی بنیاد ہیں، اور ان ہی اصولوں پر وہ بے دین جمہوری قومی ریاست (Secular Democratic National State) بنتی ہے، جسے آج کل اجتماعی تنظیم کی مہذب ترین معیاری صورت سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں اصول غلط ہیں۔ صرف غلط ہی نہیں، ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہی اصول ان تمام مصائب کی جڑ ہیں جن میں آج انسانیت مبتلا ہے۔ ہماری عداوت دراصل ان ہی اصولوں سے ہے اور ہم اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان اصولوں پر کیا اعتراض ہے اور کیوں اعتراض ہے؟ اس کی تفصیل کے لیے تو بڑی لمبی بحث درکار ہے، مگر میں اسے چند الفاظ میں آپ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ آپ ہماری اس لڑائی کی اہمیت اچھی طرح سمجھ سکیں اور آپ کو اندازہ ہو کہ کیوں یہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ ان اصولوں کے خلاف جدوجہد کرنا ناگزیر ہے۔

سب سے پہلے اس لادینی یا دنیاویت کو لیجیے جو اس نظام زندگی کا اولین سنگ بنیاد ہے۔ یہ نظریہ کہ خدا اور مذہب کا تعلق صرف آدمی کی انفرادی زندگی سے ہے، سراسر ایک مہمل نظریہ ہے جسے عقل و خرد سے کوئی سروکار نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ خدا اور انسان کا معاملہ دو حال

سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یا تو خدا انسان کا اور اس ساری کائنات کا، جس میں انسان رہتا ہے، خالق اور مالک اور حاکم ہے، یا نہیں ہے؟ اگر وہ نہ خالق ہے، نہ مالک اور نہ حاکم تب تو اس کے ساتھ پرائیوٹ تعلق کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ نہایت لغو بات ہے کہ ایک ایسی غیر متعلق ہستی کی خواہ مخواہ پرستش کی جائے جس کا ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر فی الواقع ہمارا اور اس تمام جہان ہست و بود کا خالق، مالک اور حاکم ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی عمل داری محض ایک ایک شخص کی پرائیوٹ زندگی تک محدود ہو اور جہاں سے ایک اور ایک دو آدمیوں کا اجتماعی تعلق شروع ہوتا ہے وہیں سے اس کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہ حد بندی اگر خدا نے خود کی ہے تو اس کی کوئی سند ہونی چاہیے اور اگر اپنی اجتماعی زندگی میں انسان نے خدا سے بے نیاز ہو کر خود ہی خود مختاری اختیار کی ہے تو یہ اپنے خالق اور مالک اور حاکم سے اس کی کھلی بغاوت ہے اور بغاوت کے ساتھ یہ دعویٰ کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں خدا کو اور اس کے دین کو مانتے ہیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل ماری گئی ہو۔ اس سے زیادہ لغو بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ایک شخص فرداً فرداً تو خدا کا بندہ ہو، مگر یہ الگ الگ بندے جب مل کر ایک معاشرہ بنائیں تو بندہ نہ رہیں۔ اجزا میں سے ہر ایک بندہ اور ان اجزا کا مجموعہ غیر بندہ، یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تصور صرف ایک پاگل ہی کر سکتا ہے۔ پھر یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہمیں خدا کی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت نہ اپنی خانگی معاشرت میں ہے، اور نہ محلے اور شہر میں، نہ مدرسے اور کالج میں، نہ منڈی اور بازار میں، نہ پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہاؤس میں، نہ ہائی کورٹ اور سکریٹریٹ میں، نہ چھاؤنی اور پولیس لائن میں اور نہ میدان جنگ اور صلح کانفرنس میں، تو آخر اس کی ضرورت ہے کہاں؟ کیوں ایسے خدا کو مانا جائے اور اس کی خواہ مخواہ پوجا پاٹ کی جائے جو یا تو اتنا بے کار ہے کہ زندگی کے کسی معاملے میں ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔ معاذ اللہ یا ایسا نادان ہے کہ کسی معاملے میں بھی اس کی کوئی ہدایت ہمیں معقول اور قابل عمل نظر نہیں آتی؟

یہ تو محض اس معاملے کا عقلی پہلو ہے۔ عملی پہلو سے دیکھیے تو اس کے نتائج بڑے ہی خوف ناک ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے جس معاملے کا تعلق بھی خدا سے ٹوٹتا ہے اس کا تعلق شیطان سے جڑ جاتا ہے۔ انسان کی پرائیوٹ زندگی درحقیقت کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے اور اس کی پوری زندگی اصل میں اجتماعی زندگی ہے وہ پیدا ہی ایک

ماں اور ایک باپ کے معاشرتی تعلق سے ہوتا ہے۔ دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے، ایک بستی سے، ایک قوم سے، ایک نظام تمدن اور نظام معیشت و سیاست سے واسطہ پیش آتا ہے۔ یہ بے شمار روابط جو اس کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اس سے جوڑے ہوئے ہیں، ان ہی کی درستی پر ایک ایک انسان کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسان کو ان روابط کے لیے صحیح اور منصفانہ اور پائدار اصول و حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار بنا، پھر نہ تو کوئی مستقل اصول ہی رہتا ہے اور نہ انصاف اور راستی۔ اس لیے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد پھر خواہش اور ناقص علم و تجربے کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لیے رجوع کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینی یا دنیاویت کے اصول پر چلتا ہے اس میں خواہشات کی بنا پر روز اصول بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، بے انصافی، اور آپس کی بے اعتمادی گھس گئی ہے۔ تمام انسانی معاملات پر انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خود غرضیاں مسلط ہو گئی ہیں۔ دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہا ہے جس میں ٹیڑھ نہ آ گئی ہو۔ ہر ایک قوم اور ملک نے اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں، جہاں تک بھی اس کا بس چلا ہے، پوری خود غرضی کے ساتھ اپنے مطلب کے اصول اور قاعدے اور قانون بنا لیے ہیں، اور کوئی بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ دوسرے اشخاص، گروہوں، طبقوں اور قوموں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ پرواہ کرنے والی صرف ایک ہی طاقت رہ گئی ہے اور وہ ہے جوتا۔ جہاں مقابلے میں جوتا یا جوتے کا اندیشہ ہوتا ہے صرف وہیں اپنی حد سے زیادہ پھیلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کچھ سکڑ جاتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ جوتا کسی عالم اور منصف ہستی کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک اندھی طاقت کا نام ہے۔ اس لیے اس کے زور سے کبھی توازن قائم نہیں ہوتا۔ جس کا جوتا زبردست ہوتا ہے وہ دوسروں کو صرف اتنا ہی نہیں سکیڑتا جتنا اسے سکڑنا چاہیے۔ بل کہ وہ خود اپنی حد سے زیادہ پھیلنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ پس لادینی اور دنیاویت کا ماحصل صرف یہ ہے کہ جو بھی اس طرز عمل کو اختیار کرے گا بے لگام، غیر ذمے دار اور بندۂ نفس ہو کر رہے گا، خواہ وہ ایک شخص ہو یا ایک گروہ یا ایک ملک اور قوم، یا مجموعۂ اقوام۔

اب دوسرے اصول کو لیجیے۔ قوم پرستی کی تشریح ابھی تھوڑی دیر پہلے میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں۔ وہ اگر آپ کے ذہن میں تازہ ہے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی لعنت ہے جو اس دور میں انسانیت پر مسلط ہوئی ہے۔ ہمارا اعتراض قومیت (Nationality) پر نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ایک فطری حقیقت ہے۔ ہم قومی خیر خواہی کے بھی مخالف نہیں ہیں بہ شرطے کہ اس کے اندر دوسری قوموں کی بدخواہی شامل نہ ہو، ہمیں قومی محبت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطے کہ وہ قومی تعصب اور اپنی قوم کی بے جا پاس داری اور دوسروں سے نفرت کی حد تک نہ جا پہنچے۔ ہم قوم کی آزادی کو بھی صحیح سمجھتے ہیں کیوں کہ اپنے معاملات کو خود انجام دینا اور اپنے گھر کا آپ انتظام کرنا ہر قوم کا حق ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت درست نہیں ہے۔ دراصل جو چیز قابل اعتراض، بلکہ قابل نفرت ہے وہ قوم پرستی (Nationalism) ہے۔ اس قوم پرستی کی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ قومی خود غرضی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ایک سوسائٹی کے اندر اس شخص کا وجود ایک لعنت ہے جو اپنے نفس اور اپنی غرض کا بندہ ہو اور اپنے مفاد کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہو، اگر ایک بستی کے اندر وہ خاندان ایک لعنت ہے جس کے افراد اپنے خاندانی مفاد کے اندھے پرستار ہوں اور جائز و ناجائز تمام ذرائع سے بس اپنا بھلا کرنے پر تلے ہوئے ہوں، اگر ایک ملک کے اندر وہ طبقہ ایک لعنت ہے جو اپنی طبقاتی خود غرضی میں اندھا ہو رہا ہو، اور دوسروں کے بھلے برے کی پروا کیے بغیر صرف اپنے فائدے کے پیچھے پڑ جائے (مثلاً بلیک مارکیٹنگ کرنے والے) تو آخر انسانیت کے وسیع دائرے میں وہ خود غرض قوم ایک لعنت کیوں نہیں ہے جو اپنے قومی مفاد کو اپنا خدا بنا لے اور اس کی پرستش کا یہ اصول مقرر کر لے کہ "حق وہ ہے جو قومی اغراض کے مطابق ہو اور باطل وہ جو ان کے مطابق نہ ہو۔" آپ کا ضمیر گواہی دے گا کہ تمام خود غرضیوں اور نفسانیتوں کی طرح یہ قومی خود غرضی و نفسانیت بھی یقیناً ایک لعنت ہے۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج اس تہذیب جدید نے تمام قوموں کو اسی لعنت میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کی بہ دولت ساری دنیا ایسے قومی اکھاڑوں میں تبدیل ہو گئی ہے جن میں سے ہر اکھاڑے کی دوسرے اکھاڑے سے لاگ ڈانٹ ہے اور دو عالم گیر دنگل ہو چکنے کے بعد ابھی پسینہ بھی خشک نہیں ہوا ہے کہ تیسرے دنگل کے لیے ڈنٹر خم تازہ کیے جا رہے ہیں۔

تیسرا اصول پہلے دونوں اصولوں کے ساتھ مل کر اس بلا کی تکمیل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، موجودہ تہذیب میں جمہوریت کے معنی ہیں جمہور کی حاکمیت۔ یعنی ایک علاقے کے لوگوں کی مجموعی خواہش کا اپنے علاقے میں مختار مطلق ہونا، اور ان کا قانون کے تابع نہ ہونا بلکہ قانون کا ان کی خواہش کے تابع ہونا، اور حکومت کی غرض صرف یہ ہونا کہ اس کا نظم اور اس کی طاقت لوگوں کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرنے کے کام آئے۔ اب غور کیجیے کہ پہلے تو لادینی نے ان لوگوں کو خدا کے خوف اور اخلاق کے مستقل اصولوں کی گرفت سے آزاد کر کے بے لگام اور غیر ذمے دار اور بندۂ نفس بنا دیا، پھر قوم پرستی نے ان کو شدید قسم کی قومی خودغرضی اور اندھی عصبیت اور قومی غرور کے نشے سے بدمست کر دیا، اور اب یہ جمہوریت ان ہی بے لگام بدمست بندگان نفس کی خواہشات کو قانون سازی کے مکمل اختیارات دیتی ہے، اور حکومت کا واحد مقصد یہ قرار دیتی ہے کہ اس کی طاقت ہر اس چیز کے حصول میں صرف ہو جس کی یہ اجتماعی طور پر خواہش کریں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی خودمختار صاحب حاکمیت قوم کا حال آخر ایک طاقت ور اور آزاد بدمعاش کے حال سے کس بات میں مختلف ہے؟ جو کچھ ایک بدمعاش فرد خودمختار اور طاقت ور ہو کر چھوٹے پیمانے پر کرے گا وہی تو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اس طرح کی ایک قوم کرے گی۔ پھر جب دنیا میں صرف ایک ہی قوم ایسی نہ ہو بلکہ ساری متمدن قومیں اسی ڈھنگ پر بے دینی، قوم پرستی اور جمہوریت کے اصولوں پر منظم ہوں تو دنیا بھیڑیوں کا میدان جنگ نہ بنے گی تو اور کیا بنے گی؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم اس نظام اجتماعی کو فاسد سمجھتے ہیں جو ان تین اصولوں کی بنیاد پر بنے۔ ہماری دشمنی لادینی قومی جمہوری نظام سے ہے، خواہ اس کے قائم کرنے اور چلانے والے مغربی ہوں یا مشرقی، غیر مسلم ہوں یا نام نہاد مسلمان۔ جہاں جس ملک اور جس قوم پر بھی یہ بلا مسلط ہوگی، ہم بندگان خدا کو اس سے ہوشیار کرنے کی فکر کریں گے اور انہیں دعوت دیں گے کہ اسے دفع کرو۔

ان تین اصولوں کے جواب میں ہم دوسرے تین اصول پیش کرتے ہیں اور سب انسانوں کے ضمیر سے اپیل کرتے ہیں کہ انہیں جانچ کر پرکھ کر خود دیکھ لو کہ تمہارا اپنا بھلا اور ساری دنیا کا بھلا ان پاک اصول میں ہے یا ان خبیث اصولوں میں؟

۱۔ لادینی کے مقابلے میں خدا کی بندگی اور اطاعت

۲۔ قوم پرستی کے مقابلے میں انسانیت

۳۔ جمہور کی حاکمیت کے مقابلے میں خدا کی حاکمیت اور جمہور کی خلافت

پہلے اصول کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اس خدا کو اپنا آقا تسلیم کریں جو ہمارا اور تمام کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ ہم اس سے آزاد اور بے نیاز بن کر نہیں بلکہ اس کے تابع فرمان اور اس کی رہنمائی کے پیرو بن کر زندگی بسر کریں۔ ہم صرف اس کی پوجا ہی نہ کریں بلکہ اس کی اطاعت اور بندگی بھی کریں۔ ہم صرف فرداً فرداً اپنی پرائیوٹ حیثیت ہی میں اس کے احکام اور ہدایات کے پابند نہ ہوں بلکہ اپنی اجتماعی زندگی کے بھی ہر پہلو میں اسی کے پابند ہوں۔ ہماری معاشرت، ہمارا تمدن، ہماری معیشت، ہمارا نظام تعلیم و تربیت، ہمارے قوانین، ہماری عدالتیں، ہماری حکومت، ہماری صلح و جنگ اور ہمارے بین الاقوامی تعلقات سب کے سب ان اصولوں اور حدوں کے پابند ہوں جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔ ہم اپنے دنیوی معاملات کو طے کرنے میں بالکل آزاد نہ ہوں بلکہ ہماری آزادی ان سرحدوں کے اندر محدود ہو جو خدا کے مقرر کیے ہوئے اصول اور حدود نے کھینچ دی ہیں۔ یہ اصول اور حدود ہر حال میں ہمارے اختیارات سے بالاتر رہیں۔

دوسرے اصول کا مطلب یہ ہے کہ خدا پرستی کی بنیاد پر جو نظام زندگی ہے اس میں قوم، نسل، وطن، رنگ اور زبان کے فرق و امتیاز کی بنا پر کسی قسم کے تعصبات اور خود غرضیاں راہ نہ پائیں۔ وہ ایک قومی نظام کے بہ جائے ایک اصولی نظام ہونا چاہیے، جس کے دروازے ہر اس انسان کے لیے کھلے ہوئے ہوں جو اس کے بنیادی اصولوں کو مان لے، اور جو انسان بھی ان کو مان جائے وہ بغیر کسی امتیاز کے پورے مساویانہ حقوق کے ساتھ اس میں شریک ہو سکے۔ اس نظام میں شہریت (Citizenship) محض ایک ریاست کے جغرافیائی حدود تک محدود نہ رہے۔ بلکہ اصولی بنیادوں پر عام ہو۔ جو لوگ ان اصولوں پر مطمئن نہ ہوں یا کسی وجہ سے ان کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، ان کو مٹانے اور دبانے اور ہضم کرنے کی کوشش نہ ہو بلکہ وہ متعین حقوق کے ساتھ اس نظام کی حفاظت (Protection) میں رہیں اور ان کے لیے ہر وقت یہ موقع کھلا رہے کہ جب بھی ان اصولوں کی صحت و تن درستی پر ان کا اطمینان ہو جائے وہ برابر کے حقوق کے ساتھ اپنی آزادانہ مرضی سے اس نظام کے کارفرما بن سکیں ـــــ یہ چیز جس کو ہم اصول انسانیت سے تعبیر کر رہے ہیں

قومیت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اسے اس کی صحیح فطری حد میں رکھتی ہے۔ اس میں قومی محبت کے لیے جگہ ہے، مگر قومی تعصب کے لیے جگہ نہیں ہے۔ قومی خیر خواہی جائز ہے مگر قومی خودغرضی حرام ہے۔ قومی آزادی مسلم ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کے خودغرضانہ تسلط سے بھی سخت انکار ہے۔ مگر ایسی قومی آزادی ہرگز تسلیم نہیں ہے جو انسانیت کو ناقابل عبور سرحدوں میں تقسیم کردے۔ اصول انسانیت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر قوم اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور کوئی قوم من حیث القوم دوسری قوم کی تابع نہ ہو، لیکن تمام وہ قومیں جو تہذیب انسانی کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو جائیں ان کے درمیان انسانی فلاح وترقی کے کاموں میں پورا تعاون ہو۔ مسابقت (Competition) کے بہ جائے معاونت ہو، باہم امتیازات اور تعصبات اور تفریقیں نہ ہوں۔ تہذیب وتمدن اور اسباب زندگی کا آزادانہ لین دین ہو، اور اس مہذب نظام زندگی کے تحت زندگی بسر کرنے والی دنیا کا ہر انسان اس پوری دنیا کا شہری ہو نہ کہ ایک ملک اور ایک قوم کا، حتیٰ کہ وہ کہہ سکے کہ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔" موجودہ حالت کو ہم ایک قابل نفرت حالت سمجھتے ہیں جس میں ایک انسان نہ تو خود ہی اپنی قوم اور ملک کے سوا کسی دوسری قوم اور ملک کا وفادار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم اپنے افراد کے سوا دوسری کسی قوم کے افراد پر اعتماد کر سکتی ہے۔ آدمی اپنے ملک کے حدود سے باہر نکلتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کی زمین میں ہر جگہ اس کے لیے رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں۔ ہر جگہ وہ چوروں اور اچکوں کی طرح شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر جگہ پوچھ گچھ ہے، تلاشیاں ہیں، زبان وقلم اور نقل وحرکت پر پابندیاں ہیں، اور کہیں اس کے لیے نہ آزادی ہے نہ حقوق۔ ہم اس کے مقابلے میں ایسا عالم گیر نظام چاہتے ہیں جس میں اصولوں کی وحدت کو بنیاد بنا کر قوموں کے درمیان وفاق قائم ہو اور اس وفاق میں بالکل مساویانہ اور مشترک شہریت (Common Citizenship) اور قطعاً بے روک ٹوک آمد ورفت کا طریقہ رائج ہو۔ ہماری آنکھیں پھر ایک دفعہ یہ منظر دیکھنا چاہتی ہیں کہ آج کا کوئی ابن بطوطہ اٹلانٹک کے ساحل سے بحرالکاہل کے ساحل تک اس طرح جائے کہ کہیں وہ غیر (Foreigner) نہ ہو اور ہر جگہ اس کے لیے جج، مجسٹریٹ، وزیر یا سفیر بن جانے کا موقع ہو۔

اب تیسرے اصول کو لیجیے۔ ہم جمہوری حاکمیت کے بہ جائے جمہوری خلافت کے قائل ہیں۔ شخصی بادشاہی (Monarchy) اور امیروں کے اقتدار اور طبقوں کی اجارہ داری کے ہم

بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنا موجودہ زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پرست ہو سکتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کے یکساں حقوق، مساویانہ حیثیت اور کھلے مواقع پر ہمیں بھی اتنا ہی اصرار ہے جتنا مغربی جمہوریت کے کسی بڑے سے بڑے حامی کو ہو سکتا ہے۔ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت کا انتظام اور حکم رانوں کا انتخاب تمام باشندوں کی آزادانہ مرضی اور رائے سے ہونا چاہیے۔ ہم بھی اس نظام زندگی کے سخت مخالف ہیں جس میں لوگوں کے لیے اظہار رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی اور سعی و عمل کی آزادی نہ ہو، یا جس میں پیدایش، نسل اور طبقات کی بنا پر بعض لوگوں کے لیے مخصوص حقوق اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے مخصوص رکاوٹیں ہوں۔ یہ امور جو جمہوریت کا اصل جوہر (Essence) ہیں، ان میں ہماری جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے، جو اہل مغرب نے ہمیں سکھائی ہو۔ ہم اس جمہوریت کو اس وقت سے جانتے ہیں اور دنیا کو اس کا بہترین عملی نمونہ دکھا چکے ہیں جب کہ مغربی جمہوریت پرستوں کی پیدایش میں ابھی سینکڑوں برسوں کی دیر تھی۔ دراصل ہمیں اس نوخیز جمہوریت سے جس چیز میں اختلاف اور نہایت سخت اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ وہ جمہور کی مطلق العنان بادشاہی کا اصول پیش کرتی ہے اور ہم اس کو حقیقت کے اعتبار سے غلط اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پادشاہی (Sovereignty) صرف اس کا حق ہے جس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، جو ان کی پرورش اور بالیدگی کا سامان کر رہا ہے جس کے سہارے پر ان کی اور ساری دنیا کی ہستی قائم ہے اور جس کے زبردست قانون کی گرفت میں کائنات کی ایک ایک چیز جکڑی ہوئی ہے۔ اس کی واقعی اور حقیقی بادشاہی کے اندر جس بادشاہی کا بھی دعویٰ کیا جائے گا، خواہ وہ ایک شخص اور ایک خاندان کی بادشاہی ہو یا ایک قوم اور اس کے عوام کی، بہ ہر حال وہ ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اس غلط فہمی کی چوٹ اصل بادشاہ پر نہیں بلکہ اس احمق مدعی پر ہی پڑے گی جس نے اپنی قدر خود نہ پہچانی۔ اس حقیقت کی موجودگی میں صحیح بھی یہی ہے اور نتائج کے اعتبار سے انسان کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ خدا کو حاکم مان کر انسانی زندگی کا نظام حکومت خلافت و نیابت کے نظریے پر بنایا جائے۔ یہ خلافت بلا شبہ جمہوری ہونی چاہیے۔ جمہور کی رائے ہی سے حکومت کے امیر یا ناظم اعلیٰ کا انتخاب ہونا چاہیے۔ ان ہی کی رائے سے اہل شوریٰ منتخب ہونے چاہئیں، اور ان ہی کے مشورے سے

حکومت کے سارے انتظامات چلنے چاہئیں، اور ان کو تنقید و احتساب کا کھلا ہوا حق ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سب کچھ اس احساس و شعور کے ساتھ ہونا چاہیے کہ ملک خدا کا ہے، ہم مالک نہیں بلکہ نائب ہیں، اور ہمیں اپنے ہر کام کا حساب اصل مالک کو دینا ہے۔ نیز وہ اخلاقی اصول اور قانونی احکام اور حدود اپنی جگہ اٹل ہونے چاہئیں جو خدا نے ہماری زندگی کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ ہماری پارلیمنٹ کا اساسی نظریہ یہ ہونا چاہیے کہ جن امور میں خدا نے ہمیں ہدایات دی ہیں ان میں ہم قانون سازی نہیں کریں گے بلکہ اپنی ضروریات کے لیے خدا کی ہدایات سے تفصیلی قوانین اخذ کریں گے، اور جن امور میں خدا نے ہدایات نہیں دی ہیں ان میں ہم یہ سمجھیں گے کہ خدا نے خود ہی ہم کو آزادیِ عمل بخشی ہے اس لیے صرف ان ہی امور میں ہم باہمی مشورے سے قوانین بنائیں گے مگر یہ قوانین لازماً اس مجموعی سانچے کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے ہوں گے جو خدا کی اصولی ہدایات نے ہمارے لیے بنا دیا ہے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ اس پورے نظام تمدن و سیاست کی کارفرمائی اور اس کا انتظام ان لوگوں کے سپرد ہو جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے اور ہر کام میں اس کی رضا چاہنے والے ہوں، جن کی زندگی گواہ ہو کہ وہ خدا کے حضور اپنی پیشی اور جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں، جن کی پبلک اور پرائیوٹ دونوں قسم کی زندگیوں سے یہ شہادت ملے کہ وہ بے لگام گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جو ہر کھیت میں چرتا اور ہر حد کو پھاندتا پھرتا ہو بلکہ ایک الٰہی ضابطے کی رسی سے بندھے ہوئے اور ایک خدا پرستی کے کھونٹے سے مربوط ہیں، اور ان کی ساری چلت پھرت اسی حد تک محدود ہے جہاں تک وہ رسی انہیں جانے دیتی ہے۔

حضرات! یہ تینوں اصول جن کی بہت ہی مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، موجودہ تہذیب کی قوم پرستانہ لادینی جمہوری حاکمیت کے مقابلے میں ایک خدا پرستانہ انسانی جمہوری خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی کا قیام ہمارا نصب العین ہے۔ یہ بات تو آپ بہ یک نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان کھلا ہوا اختلاف ہے۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اپنے ضمیر پر منحصر ہے کہ ان میں سے کون بہتر ہے، کس میں آپ کی فلاح ہے، کس کے قیام کا آپ کو خواہش مند ہونا چاہیے اور کس کے قائم کرنے اور قائم رکھنے میں آپ کی قوتیں صرف ہونی چاہئیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان سے تو میں صاف کہتا ہوں کہ موجودہ زمانے کی لادینی قومی جمہوریت تمہارے دین و ایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ جس اسلام کے نام پر تم اپنے

آپ کو مسلمان کہتے ہو اس کی روح اس نظام کی روح سے، اس کے بنیادی اصول اس کے بنیادی اصولوں سے اور اس کا ہر جزو اس کے ہر جزو سے متصادم ہے۔ اسلام اور یہ نظام ایک دوسرے سے کہیں بھی مصالحت نہیں کرتے۔ جہاں یہ نظام برسر اقتدار ہوگا وہاں اسلام نقش بر آب رہے گا اور جہاں اسلام برسر اقتدار ہوگا وہاں اس نظام کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم اگر واقعی اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد ﷺ لائے تھے تو تمہارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو اس قوم پرستانہ لادینی جمہوریت کے مقابلے میں خدا پرستانہ انسانی خلافت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرو۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں تم بہ حیثیت ایک قوم کے برسر اقتدار ہو وہاں تو اگر تمہارے اپنے ہاتھوں سے اسلام کے اصلی نظام کے بہ جائے یہ کافرانہ نظام بنے اور چلے تو حیف ہے تمہاری اس جھوٹی مسلمانی پر جس کا نام لینے میں تم اتنے بلند آہنگ اور جس کا کام کرنے میں تم اتنے جی چور ہو۔

اس سلسلے میں جملہ معترضہ کے طور پر اپنے مسلمان بھائیوں سے مجھے ایک بات اور بھی کہنی ہے۔ بعض مذہبی جامہ پہننے والے لوگ آپ کو اس غلط فہمی میں ڈال رہے ہیں اور شاید خود بھی اس دھوکے میں ہیں کہ "حکومت تو ایک انعام ہے جو نمازیں پڑھنے اور نیکیاں کرنے کے صلے میں خدا کی طرف سے ملا کرتا ہے، اس کے حصول کی کوشش محض دنیا پرستی اور اس کو نصب العین بنانا خلاف اسلام ہے۔" یہ باتیں جو لوگ کرتے ہیں انہوں نے اس معاملے کو سرے سے سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی ہے، اور اگر وہ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ وہ سمجھنا چاہتے بھی نہیں ہیں، کیوں کہ اس طرح وہ عیش منغص ہو جائے گا جو موجودہ نظام کی فرماں روائی میں ان کو حاصل ہے، یا حاصل ہونے کا لالچ ہے۔ یہ لوگ اس سارے معاملے کو انعام کے پہلو سے دیکھ رہے ہیں اور فرض کا پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بے شک خلافت الٰہیہ کا قائم ہو جانا ایک انعام ہے مگر اس کے قیام کی کوشش کرنا ایک فرض بھی تو ہے تاکہ خلافت شیطانیہ کی جگہ وہ نظام حق برپا ہو، جس میں برائیاں دبیں اور نیکیاں پروان چڑھ سکیں۔ تم فرض سے جی چراتے ہو اور انعام کی امید رکھتے ہو؟ یہ بوالفضولی تمہیں کو مبارک رہے!

رہے غیر مسلم حضرات، تو ان سے میری خیر خواہانہ گزارش یہ ہے کہ براہ کرم اصول کے معاملے میں ان تعصّبات کے قفل اپنے دلوں پر نہ چڑھایئے جو پچھلی تاریخ اور آج کی کش مکش کی وجہ سے ہمارے اور آپ کے درمیان پیدا ہو گئے ہیں۔ اصول کسی قوم کی آبائی جائداد

نہیں ہوتے، نہ ان پر کسی قومیت کا ٹھپا لگا ہوا ہوتا ہے، وہ اگر صحیح اور مفید ہیں تو سب انسانوں کے لیے صحیح اور مفید ہیں، اور اگر غلط ہیں تو سب ہی کے لیے غلط ہیں، بلا لحاظ اس کے کہ کون ان کا پیش کرنے والا ہے اور کس زبان میں انھیں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حفظان صحت کے اصولوں میں، طب کے اصولوں میں، تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت کے اصولوں میں، سائنس اور دوسرے علوم و فنون کے اصولوں میں یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ فلاں ملک اور فلاں قوم کی چیزیں ہیں اس لیے دوسرے ان سے تعصب کریں۔ آپ جس صحیح اصول کو قبول کرنے میں بھی تعصب سے کام لیں گے اپنا ہی نقصان کریں گے، بالکل یہی معاملہ اخلاق، تمدن، معاشرت، تہذیب، معیشت اور سیاست کے اصولوں کا بھی ہے۔ یہ بھی درحقیقت غیر قومی اور غیر نسلی چیزیں ہیں۔ ان کو بھی ان کے حسن و قبح (Merit and Demerit) ہی کے لحاظ سے قبول یا رد کرنا چاہیے۔ آپ صحیح اصول اختیار کریں گے تو اپنا بھلا کریں گے، کسی پر کوئی احسان نہ کریں گے۔ غلط اصولوں کی پیروی کریں گے تو اپنا نقصان کریں گے۔ کسی کا کچھ نہ بگاڑیں گے۔

آپ نے خود بھی دنیا کے دوسرے اصولوں کے معاملے میں تعصب نہیں برتا ہے۔ یہ لادینی، یہ قوم پرستی، یہ مغربی جمہوریت آپ کے پاس ان انگریزوں ہی کے ذریعے سے تو آئی ہے جو دو سو برس آپ پر ظالمانہ حکومت کرتے رہے اور جن کے خلاف چالیس پچاس سال آپ آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ پھر ان دشمنوں کے لائے ہوئے اصولوں کو قبول کرنے میں آپ نے کیوں تعصب سے کام نہ لیا؟ یہ سوشلزم اور کمیونزم جن کی طرف آپ میں سے بہت سے لوگ لپک رہے ہیں جرمنی کے ایک یہودی دماغ سے نکلے اور روس میں پروان چڑھے۔ ان قوموں سے آخر آپ کا کیا رشتہ ہے؟ پھر آپ نے انہیں اجنبی کیوں نہ سمجھا؟ اگر ان کے معاملے میں آپ تعصب کو بالائے طاق رکھ سکتے ہیں اور اصول کو اصول ہی کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ جو اصول ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان پر غور کرنے میں یہ خیال آپ کی نظر و فکر کو الجھا دے کہ ان کے پیش کرنے والے لوگ ایسی قوم کے افراد ہیں جس سے آپ کچھ تاریخی شکایات رکھتے ہیں یا جس کے ساتھ آج آپ کی لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔

ہم دلائل کے ساتھ ان غلط اصولوں پر تنقید کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک انسانیت کے لیے تباہ کن ہیں اور ان کے جواب میں وہ اصول پیش کر رہے ہیں جن کے اندر ہمیں اپنی،

آپ کی، اور سب انسانوں کی فلاح نظر آتی ہے۔ آپ کھلے دل سے دیکھیے کہ آپ کا اپنا بھلا فی الواقع کن اصولوں کی پیروی میں ہے۔ خود جانچ کر دیکھ لیجیے کہ خدا پرستی بہتر ہے یا بے دینی، قوم پرستی بہتر ہے، یا انسانیت، جمہور کی مطلق العنانی بہتر ہے یا خدا کی بادشاہی کے تحت جمہوری خلافت، انسانی معاملات کی باگیں خدا سے بے خوف لوگوں کے ہاتھوں میں رہنی بہتر ہے یا ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ اگر آپ کا دل گواہی دے کہ یہ چیز جو ہم پیش کر رہے ہیں زیادہ صحیح اور نتائج کے لحاظ سے زیادہ اچھی ہے تو اسے اختیار کر کے آپ خود اپنی ہی خیر خواہی کریں گے۔

اس کے بعد صرف عملی سوال حل طلب باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس خدا پرستانہ نظام کو چلانے کے لیے ہدایات کہاں سے حاصل کی جائیں؟ وہ خدائی قانون وہ دستور کون سا ہے جس پر ہم اپنی ریاست کی بنیاد رکھیں؟ بہ ظاہر یہ سوال بہت پیچیدہ ہے، کیوں کہ جس آسانی کے ساتھ حکومت الٰہیہ، رام راج یا (Kingdom of God) کے سادہ تصور پر لوگوں کے درمیان اتفاق ہوسکتا ہے، اسی آسانی کے ساتھ کسی دستور وقانون کو خدائی دستور وقانون کی حیثیت سے قبول کر لینے پر اتفاق نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ پیچیدگی ایسی سخت نہیں ہے کہ اس کو کسی طرح رفع کیا ہی نہ جاسکتا ہو۔

اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصے میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عام کو ہموار کر کے اس دستور وقانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں، جسے ہم مسلمان خدائی دستور وقانون مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلے میں یہ خدا پرستانہ جمہوری خلافت، جو محمد ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی، کہاں تک خود باشندگان پاکستان کے لیے اور کہاں تک تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں آپ کی اکثریت اور ہماری اقلیت ہوگی۔ وہاں ہم آپ سے عرض کریں گے کہ خدارا دنیا کی بگڑی ہوئی قوموں سے وہ اصول نہ لیجیے جن کی وجہ سے وہ خود بھی خراب ہو رہی ہیں اور دنیا کو بھی خراب کر رہی ہیں ان کے بجائے آپ پہلے یہ تین اصول مان لیجیے جن کو ہر زمانے میں خدا کے نیک

بندے لے کر آئے ہیں، جنہیں آپ کے بزرگ بھی اسی طرح پیش کرتے تھے جس طرح ہمارے بزرگوں نے پیش کیا تھا۔ پھر اپنے بزرگوں کی تعلیمات میں تلاش کیجیے کہ ان اصولوں کے مطابق ایک ریاست ــــ زمانۂ حال کی ایک ترقی پذیر ریاست ــــ کا نظام چلانے کے لیے کوئی مفصل ہدایت ملتی ہے یا نہیں۔ رام چندر جی، کرشن جی، بودھ مہاراج، گورونانک اور دوسرے تمام رشیوں اور منیوں کی تعلیم اور ان کی سیرتوں کا جائزہ لیجیے۔ ویدوں اور پرانوں اور شاستروں اور گرنتھوں کو دیکھیے کہ اگر ان میں کوئی ہدایت آپ کو ملے تو ہم کہیں گے کہ آپ ہندستان کی ریاست کا نظام اسی پر قائم کیجیے اور ہم سے وہی برتاؤ کیجیے جو آپ کا دین ہمارے لیے تجویز کرتا ہے۔ ہم اس نظام کی مزاحمت نہیں کریں گے۔ اسے کام کرنے کا پورا موقع دیں گے اور بغیر کسی تعصب کے یہ دیکھیں گے کہ آپ خدا پرستی، انسانیت اور خدا پرستانہ جمہوریت کی جو عملی تعبیر پیش کرتے ہیں وہ کہاں تک ہندستان کے لیے اور کہاں تک دنیا کے لیے رحمت و برکت کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے ہاں ایسا کوئی مفصل ہدایت نامہ نہ پائیں، تو اس کے معنی یہ نہیں، کہ وہ خدا نے آپ کے ہاں بھیجا نہیں تھا، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اپنی طویل تاریخ کے انقلاب میں اسے یا اس کے ایک بڑے حصے کو آپ کھو بیٹھے ہیں۔ وہی چیز اس خدا کی بھیجی ہوئی، ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس سے اپرایے نہیں، یہ آپ ہی کی کھوئی ہوئی چیز ہے جو ایک دوسرے ذریعے سے آپ کے پاس واپس آئی ہے۔ آپ اسے پہچاننے کی کوشش کریں، اسے جانچیں، پرکھیں اور برت کر دیکھیں کہ اس میں واقعی آپ کی اور دنیا کی فلاح ہے یا نہیں؟